Solution 2023-24

Subject: Urdu (Elective)
Class: XII
Code: 003

Maximum Marks 80 Time: 3 Hours

جواب نمبر 1-

1- پرانا گھر

2-حکیم محمد حسن خان مرحوم

3- حکیموں کے

4- کیونکہ راجا کے سپاہی وہاں تھے ۔

5- انگریز حکام ۔

یا

1-انہیں بھگا کر خود نسخہ لکھتا ہے ۔

2- اسے کافی نقصان پہنچتا ہے ۔ اور وہ اس کے احساس برتری کا مظہر ہے

3-مفتی خواجہ بد یع صاحب علیہ الرحمۃ والغفران بتاتا ہے ۔

4-کتاب خشک ہو جاتی ۔

5-چالاک اور دوراندیشی ۔

جواب نمبر 2-(i) مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خطوط اردو نثر کے اعلیٰ شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں کیونکہ آپ کے خطوط نویسی کا طریقہ بالکل نرالا ہے اور ان کا سر ما یہ نثر صرف ان کے خطوط ہی ہیں جو انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد اردو میں لکھے ہیں، اس سے قبل وہ تمام خطوط فارسی میں لکھتے تھے۔ ان کے اردو خطوط نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔ غالب نے فرسودہ ، مروجہ مکتوب نگاری کے طریقے سے انحراف کیا اور ایک نیا راستہ نکالا یعنی مکتوب نویسی میں گفتگو کی زبان استعمال کی ہے اور ان کی نثر میں بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ غالب کے خطوط کے مجموعے ۱۔ عود ہندی ۲۔ اردوئے معلیٰ **خصوصیات**: ا۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا: یعنی بات چیت کے انداز میں خطوط لکھے ، ان کے خطوط کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دو بے تکلف دوست آمنے سامنے گفتگو کر رہے ہوں ۔ غالب نے اپنے ایک خط میں خود ہی یہ کہا ہے کہ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، ہزار ہا کوس دور بیٹھے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو " ان کے خطوط میں سلاست وروانی ہے، شوخی و ظرافت ہے، بے تکلفی ہے، عام بول چال اور روزمرہ کی زبان میں سادہ اور آسان طریقے استعمال ہوئے ہیں، ہنسی مذاق کی باتیں کرنے میں غالب کو قدرت حاصل ہے۔ غالب جس کو خط لکھتے ہیں اُس سے اِس طرح خطاب کرتے ہیں جیسے کہ وہ ان کے سامنے بیٹھا ہو اور اس سے باتیں کر رہے ہوں۔ ۲- لمبے چوڑے القاب و آداب کے استعمال کو ترک کیا : انھوں نے قدیم روش کو اختیار نہیں کیا بلکہ نیا انداز تحریر ایجاد کیا اور چھوٹے القاب استعمال کئے جیسے: برخوردار ، جانِ غالب، بندہ پرور،میاں ، بھائی ، صاحب، وغیرہ ۳ -غالب کے خطوط تاریخی دستاویزات ہیں: کیونکہ ان کے زمانے خصوصاً ۱۸۵۷ء کے آس پاس کا ماحول غالب کے خطوط میں جس تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اس لحاظ سے ایک تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(ii) پیروڈی کے فن پر کلیم الدین احمد کے خیالات۔

احمد جمال پاشا نے اردو نقادوں کی ایک پیروڈی " کپور کا فن" کے نام سے لکھی جس میں کلیم کے انداز بیان کا بھی چر بہ اڑایا گیا ہے جس کو پڑھ کر کلیم الدین احمد نے خط لکھا جس میں کہا " کپور ایک مطالعہ" پسند آیا پیروڈی خوب ہے اردو کے لئے ایک نئی چیز ہے اس فن کو ترقی دیں ۔ آپ کا خیال غلط ہے ، میں نے برا نہیں مانا پیروڈی تو شاہکاروں کی ہوتی ہے ، یہ تو کارٹون کا فن ہے آپ کا انداز مزاق اڑانے کا نہیں بلکہ اسلوب کو نمایاں کرنے کا ہے۔

جواب نمبر 3-(i) آزاد کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں کہ وہ عالم و فاضل ہے ، بہادر ہے اعلیٰ اوصاف کا حامل ہے ، اس میں فکر کی بلندی بھی ہے عاشق مزاجی اور ہنسی مذاق بھی معیاری اور بلند سطحی ہے۔

اور خوجی کی نمایاں خصوصیات کہ وہ عالم و فاضل تو نہیں لیکن اپنی علمیت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ بہادر تو نہیں لیکن اپنی بہادری کا اظہار کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے ۔

(ii) یہ نصیحت ہے کہ خدا کی مخلوق کو حقیر انہیں سمجھنا چاہیے اسی حقیر نے خدائی کا دعوی کرنے والے حقیر نمود کا غرور توڑا تھا اور اس کی خدائی خاک میں ملا دی تھی اس کے علاوہ اس سبق میں شب بیداری اور ذکر الہی ، عبادت الہی کی تلقین کی ہے ۔

(iii) قرة العین حیدر نے افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام حاصل کیا ، ان کے افسانے کی خصوصیات -تاریخ، تہذیب، اور زبان پر گہری گرفت ہے، اسی چیز نے ان کے افسانوں میں ایک نیا انداز پیدا کیا اور بہت جلد اردو ادب کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئیں۔

کہانی کہنے کا فن اور قاری (پڑھنے) کو باندھے رکھنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ انداز بیاں میں شگفتگی خوب پائی جاتی ہے اسی طرح ان کے جملے فکر اور فلسفہ کی چاشنی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

کردار نگاری میں قرة العین حیدر کو کمال حاصل ہے، وہ کردار کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ اس سے اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔

مکالمے برجستہ ہوتے ہیں اور ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کا بھر پور مجموعی تاثر ہوتا ہے۔

(iv) اپنے ماضی کے بارے میں رام لعل لکھتے ہیں کہ پھر میری نظروں کے سامنے مغل پور ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین ابھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطورا پیر نٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا ۔ وہ وہاں اپنے قلم کے رشتہ داروں سے ہی اب ملنے گئے تھے ، لہذا وہ جگہ کی وہاں سب سے ملے وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ : نقل مکانی مجھے وراثت میں ملی تھی ، اب میں عارضی طور سے اس طرف لوٹ رہا ہوں، جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانس لی تھی ۔ اور جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے کیونکہ اس وقت میں صرف دو ڈھائی سال کا تھا میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی تو وہ میری کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا اور ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو بالکل اجنبی بن جائے ، کسی دوسری ہی دنیا کا انسان جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں ۔ ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے گہرا رشتہ قائم کر رکھا ہے۔

جواب نمبر 4- (i) الطاف حسین حالی

(ii) صنعت تضاد

(iii)محبوب یا معشوق .

(iv) سے ہم

(v) صنعت تعلی

جواب نمبر 5- (i) اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی سب سے بہتر تخلیق ہے، وہ اشرف المخلوقات ہے، باقی تمام چیزیں اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ہر چیز اس کی محکوم ہے، اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد پھر انسان کو اپنے منصب ومقام کا شعور بھی حاصل کرنا چاہئے۔

(ii) اس نظم کا موضوع بے ثباتی دنیا ہے۔ ویسے اردو ادب اور شاعری میں یہ موضوع خاصا مرغوب رہا ہے، اس میں وہی بات کہی گئی ہے کہ زندگی کا انجام موت ہے، امیر غریب کسی کو بھی اس سے مفر نہیں ہے، ایک نہ ایک دن سب کو اس کی زد میں آنا ہے اور ایک دن مرنے والے کی ہڈیاں تک خاک میں مل جاتی ہیں۔ مرنے والے کے اچھے کام اور اس کی محبتیں ہی رہ جاتی ہیں۔

جواب نمبر 6- (i) بانگ دراں ، بال جبریل، ضرب کلیم ، ارمغان حجاز

(ii) اس شعر میں فنا کا تصور ہے کہ اگر زندگی ملی ہے تو اس کا خاتمہ لازمی ہے جس طرح ہر شام اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ صبح ہوگی ۔

(iii) جب شاعر مقطع کے شعر میں اپنی تعریف کرے تو اسے صنعت تعلی کہتے ہیں ۔

مثال- اور بھی ہیں دنیا میں سخنور بہت اچھے۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔

(iv) تعمیر خودی کا مطلب ہے کہ خود اپنے آپ کو پہچاننا یعنی اپنی خودی کی تعمیر کرنا اور اپنے اندر وہ بات پیدا کرنا جس سے اپنے منصب مقام کا شعور حاصل ہو سکے تو پھر اس کے بعد دیکھو کہ تمہاری آہیں اپنا اثر کیسے دکھاتی ہیں۔

جواب نمبر7- (i) ویکوم محمد بشیر(1994 to 1910)

محمد بشیرکی ولادت کیرالا میں ہوئی۔ ان کے والد عمارتی لکڑی کے ٹھیکے دار تھے۔ کاروبار میں بڑے نقصان سے دوچار ہونے کی اجہ سے ان کا گھرانا غریبی اور تنگ دستی کا شکار ہو گیا۔محمد بشیر بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ملنسار انسان تھے۔ نہایت حساس طبیعت رکھتے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر میں وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے ۔ اس کی وجہ سے انھیں اسکول چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کی وجہ سے انھیں کیرالا بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں ملک کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملتے جلتے رہے۔ یہ دور تجربات کے لحاظ سے ان کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں رفتہ رفتہ یقین ہوتا گیا کہ زندگی اپنی رنگارنگی کے باوجود دنیا میں ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی پیدائش اور موت کے درمیانی وقفے کو کسی نہ کسی طور گزار دینے کی جدو جہد میں مصروف رہتا ہے۔محمد بشیر نے 1937 کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر 27 سال تھی۔ وہ زندگی کا جو وسیع اور رنگا رنگ تجربہ حاصل کر چکے تھے، اس سے بہت کم لوگ گزرتے ہیں۔ دراصل یہی تجربات بشیر کی زندگی کے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دیکوم محمد بشیر کی پہلی اہم تخلیق " بچپن کی ساتھی (مطبوعہ 1944) ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب زندگی کا ایک ورق قرار دیا۔ اس کہانی نے ملیالم کے افسانوی ادب کو نئی راہ دکھائی۔ محمد بشیر کی کہانیاں زندگی کی حقیقوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی بنیاد ان کے حقیقی تجربے تھے۔ وہ اپنی بات نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم انداز میں لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ملیالم ناول اور افسانے کی زبان پر ان کی تخلیقات کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا ہے۔ دیکوم محمد بشیر کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔

(ii) خلاصہ: مصنف کا جنم دن ہے لیکن مفلسی کا یہ حال ہے کہ آج کے دن بھی اس کے پاس نہ نئے کپڑے ہیں اور نہ ہی قرض لینے کا کوئی ذریعہ۔ پڑوسی نے جنم دن کی مبارک باد دی۔ مصنف اپنے گھر سے دور ہے۔ ایک مفلس مصنف جس سے پبلشر کہانیاں لکھواتا ہے مگر پیسے نہیں دیتا ہے۔ اپنے دوستوں کا قرض دار ہے۔ آج اپنے جنم دن پر اس کے پاس چائے پینے کے پیسے نہیں ہیں۔ اب تو چائے بھی ادھار نہیں ملتی۔ مکان مالک کرایہ نہ ملنے کی وجہ سے مکان خالی کرانے کے لئے کہتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر الٹے سیدھے مضمون لکھنے پر اسے ڈانٹتا ہے۔ تنگ دستی سے تنگ آکر وہ خود کشی کرنے کی سوچتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آج میرا جنم دن ہے۔ میں کوئی غلط کام نہیں کوں گا ۔ شام ہو جاتی ہے۔ بھوک سے اس کا دل بوجھل ہے، ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ اس کے دوست نے لنچ پر بلایا تھا۔ جب وہ اس کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ دوست کسی ضروری کام سے اچانک چلا گیا۔ یہ مایوس ہو کر واپس چلا آتا ہے۔ راستے میں بھوک سے نڈھال ہو کر گرتا پڑتا گھر کی طرف واپس آجاتا ہے۔ راستے میں جو بھی جان پہچان کے ملے وہ بھی یوں ہی گزر گئے اور اس کے پیچھے سی آئی ڈی کا آدمی لگا ہوا ہے۔ ایک اجنبی عورت ڈھنگ کے کپڑے پہنے ہوئے خود اس سے مدد مانگتی ہے کیونکہ اس کا شہر سیلاب میں تباہ ہو چکا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ بہن میرے پاس کچھ نہیں ہے تبھی بینک کلرک کا ملازم لڑکا ماچس مانگنے آتا ہے اور مصنف اس سے پانی مانگ کر پیتا ہے۔ لڑکا اس کی حالت دیکھ کر دور وپے واپسی کے وعدے پر اسے ادھار دینے کا وعدہ کرتا ہے لیکن وہ صرف دو آنے لے کر آتا ہے۔ مصنف ایک آنے میں چائے ، بیڑی اور ڈوسا منگا تا ہے دونوں کھاتے ہیں، مکان مالک کا کھانا رکھا ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو اسے بے چین کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر مکان مالک نہیں ہے، باورچی خانے میں گھس کر پیٹ بھر کر کھانا کھالیتا ہے اور پھر واپس اپنے کمرے میں آجاتا ہے۔

جواب نمبر8-(i) اس افسانے کا عنوان " جنم دن اس لئے رکھا گیا کیونکہ ان افسانے میں ایک مفلس انسان کے جنم دن کو پیش کیا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کا یہ پورا دن کیسے گزرا اور اس نے عہد کیا تھا کہ اس دن وہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا مگر بھوک سے مجبور ہوکر اسے کھانا چرا کر کھانا پڑا۔ جنم دن کی اس موثر روداد کے لئے جنم دن سے مناسب نام کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، اسی لئے اس افسانے کا نام جنم دن رکھا گیا۔

(ii)نر مل ورما ایک بے مثال تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے افسانہ، ناول، ڈراما، سفر نامہ اور ڈائری، غرض کہ کئی صنفوں میں اپنی صلاحتوں کا اظہار کیا ہے " پرندے " ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں" جلتی جھاڑی" ,"پچھلی گرمیوں میں" ،" بیچ بحث میں "," کوے اور کالا پانی "وغیرہ ہیں۔ نرمل ورما کے ناول " وے دن"،"لال ٹن کی چھت " , " ایک چیتھڑا سکھ ","رات کا رپورٹر" ،" انتم ارنیہ", ناموں سے شائع ہوچکے ہیں۔ چیڑوں پر چاندنی، ہر بار ش میں وغیرہ ان کے سفرنامے ہیں۔ تنقیدی اور تہذیبی مسائل پر مضامین کے کچھ مجموعے اس کے علاوہ ہیں ۔

نرمل ور ماکو ان کی ادبی خدمات پر مختلف اداروں کی طرف سے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ،سادھناسمان، رام منوہرلو ہیاسمان، مورتی دیوی ایوارڈ،منتھلی شرن گپت سمان اور بھارتیہ گیان پیٹھ کا انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 2001 میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ نرمل ورما کا انتقال دہلی میں ہوا۔

(iii) چرویا کوف کی موت کا سبب احساس پشیمانی ہے، اگر جنرل بری ڈالوف اسے معاف کر دیتا تو اس کی موت نہ ہوتی۔ چرویا کوف کو صرف اس بات کی شرمندگی تھی کہ اس سے یہ غیر اخلاقی عمل سرزد ہوا اور اسی شر مندگی نے اس کی جان لے لی۔

(iv) افسانہ جلتی جھاڑی " میں بوڑھے کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ --- وہ بوڑھا آدمی تھا، ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھتا تھا بالکل خاموش، بے حس و حرکت منہ میں پائپ دبی ہوئی تھی ہاتھ میں چھلی پکڑنے کا کا نٹاتھا اور کوٹ پہن رکھاتھا لیکن اس کا دھیان کانٹے کی طرف نہ ہوکرجزیرے سے دور شہر کے پلوں کی طرف تھا کیونکہ وہ اُدھرہی دیکھ رہا تھا۔ رہ رہ کرمنہ میں د بی پائپ ہل رہی تھی۔

جواب نمبر9-(i) اس تحریک کا اہم مقصد جدید علوم کا فروغ تھا اور انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کی ترقی کا واحد ذریعہ جدید تعلیم ہے اس مقصد کے تحت جب سرسید احمد خاں غازی پور میں تھے تو وہاں ۱۸۶۳ء میں سا ئنٹیفک سوسائی " قائم کی اور اس سوسائٹی کے تحت مغربی علوم کی کتا میں اردو میں ترجمہ کی گئیں تا کہ جدید علوم سے واقفیت عام ہو سکے، اور اس کے علاوہ ایک اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے جاری کیا۔ ۲۔ سرسید کا ماننا تھا کہ جدید علوم ہی مسلمانوں کا واحد علاج ہے اور جب ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ گئے تو اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیمی نظام، طلباء کے طرز رہائش اور تعمیرات کا بغور جائز ولیا اور وہاں سے لوٹنے کے بعد ۵ ۱۸۷ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او۔) کی بنیاد علی گڑھ میں ڈالی جسے ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ ملا، اب اس ادارے کا نام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ - سرسید احمد خان کا ایک اور اہم مقصد معاشرے کی اصلاح کا تھا چنانچہ انھوں نے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے پر بھی زور دیا چونکہ سماج میں طرح طرح خرابیاں جڑ پکڑ چکی تھیں جیسے کاہلی ،سستی ، ریا کاری، جھوٹی شان و شوکت ضعیف الاعتقادی وغیرہ ۔ سرسید جب انگلینڈ گئے تو اپنے سفر کے دوران وہ انگریزوں کی شائستگی اور تہذیب سے بہت متاثر ہوئے اور یہیں پر انہیں معلوم ہوا کہ ایک زمانہ تھا کہ انگلینڈ کے باشندے بھی طرح طرح کی معاشرتی برائیوں میں مبتلا تھے تا ہم اسٹیل اور ایڈیسن نام کے دو صاحب نظر حضرات نے دور سالے میٹلر اور اسپیکٹر " جاری کئے اور اپنے معاشرے کی اصلاح میں کامیابی حاصل کی چنانچہ سرسید نے طے کیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنے ملک میں اصلاحی خدمات انجام دیں گے اور ہندوستان واپس آکر انھوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور اس میں انھوں نے معاشرتی واصلاحی موضوعات پر مضامین لکھے۔

(ii) ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا (یا اغراض و مقاصد)

آغاز و پس منظر: ۱۹۱۷ ء میں روس میں ایک زبردست انقلاب رونماں ہوا ، روس کے محنت کش لینن کی سربراہی میں بادشاہ روس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا ، مزدوروں اور کسانوں کی اس شاندار فتح کی گونج ساری دنیا میں سنائی دی، اس وقت ساری دنیا میں یہ احساس عام ہوا کہ شاعر اور ادیب جو اپنے سینے میں درد دل رکھتا ہے وہ ظالم اور مظلوم کی جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا بلکہ اسے اپنا فرض نبھانا چاہئے اس مقصد کے تحت ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر کے ادیب جمع ہوئے اور اس کا نفرنس میں ہمارے ملک کی طرف ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے شرکت کی۔ یہ دونوں ادیب اس وقت لندن میں مقیم تھے اور وہیں پر کئی دیگر نو جوانوں کی مدد سے " انجمن ترقی پسند مصنفین " کا قیام عمل میں آیا ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا اور اس تحریک کا ایک منشور تیار کیا گیا جس پر سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ایس۔ بھٹ، ڈاکٹر محمد دین اور ملک راج آنند نے دستخط کئے۔

ترقی پسند تحریک کی فکری بنیادیں :۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی فکری مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔ ا۔ ترقی پسند تحریک کے علمبر دار ادب برائے زندگی پر یقین رکھتے تھے ۔ ۲۔ ادب میں نئے خیالات اور نئے نظریات کے قائل تھے، ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلانا چاہتے تھے یہاں تک کہ اقبال جیسے شاعر کو بھی رجعت پرست شاعر کہہ دیا۔۳۔ غریبوں، مظلوموں، سماج کے دبے کچلے لوگوں کے استحصال اور ان کی حق تلفی کے خلاف آواز بلند کئے اسی طرح عوام کے دکھ سکھ، جدوجہد اور مسائل کے ترجمان بن کر روشن مستقبل کی راہ دکھائی ۔ ۴۔ اس انجمن نے بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی جیسے مسائل کو موضوع بنایا۔ ۵۔ اسی تحریک نے شعر و ادب میں نئے افکار کی ہوا چلائی جس سے ادیبوں اور شعراء نے خواب و خیال کی دنیا سے

نکل کر حقیقتوں کی دنیا میں سانس لینا سیکھا، اس طرح حقیقت نگاری کا فروغ ہوا۔ ادب کی افادیت پر زور دیا، موضوعات کا دائرہ وسیع کیا ، اردو شعر و ادب کا دامن وسیع کیا اور عوام کے نزدیک لائے محنت کشوں کی حمایت کی ، اسی طرح مواد اور موضوع پر زور دیا۔

(iii) فورٹ ولیم کالج کی خدمات:- فورٹ ولیم کالج کی خدمات اردونثر میں نا قابل فراموش ہیں،یہ صحیح ہے کہ اس کالج میں اعلی درجہ ك کتا بیں نہیں لکھی گئیں بلکہ قصّے، کہانیوں کی کتابوں پر زیادہ زور دیا گیا اوران کتابوں میں بیشتر تراجم تھیں، در اصل اس کالج کا مقصدہی یہ تھا کہ انگریزوں کو یہاں کی عوامی بول چال کی زبان کو سکھانا، اس لئے کالج میں جتنی بھی کتا بیں لکھی گئیں عام فہم، آسان اور بول چال کی زبان میں لکھی گئیں، ان کتابوں میں میرامن کی باغ و بہار“ کو شہرتِ عام حاصل ہوئی۔ جس وقت کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا ، اس سے پہلے جتنی بھی کتابیں موجود تھیں وہ نہایت ہی مشکل، پیچیدہ اور ان کی عبارتیں مقفیٰ مشجع تھیں ، ان میں بیشتر کتابیں تصوف کے موضوع پر لکھی گئی تھیں اس لئے یہ کتا بیں نو وار دانگریزوں کو سکھانے کے لئے کافی نہیں تھیں اور درسی نصاب میں شامل کر نا قد ر دشوار تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسی کتابیں حاصل کی جائیں جو آسمان، عام فہم اور عوام کی بول چال والی ہوں ، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ملک کے کونے کونے سے ادبیوں کو جمع کیا تا کہ وہ آسان اور عام بول چال کی زبان میں ترجمہ کریں۔ اس طرح پہلی بار اجتماعی طور پر سادہ نگاری کو پیش نظر رکھ کر کام کیا گیا۔ فورٹ ولیم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اردو نثر کو سادہ نگاری کی طرف مائل کیا جس پر آگے چل کر مرزا اسد اللہ خاں غالب اور سرسید نے جدید نثر کی بنیاد کھڑی کی۔

(iv) دبستان دہلی کی شاعری کی خصوصیات:- دبستان دہلی کی شاعری اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہو کر ایک الگ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور جاٹوں، مراٹھوں کی لوٹ مار سے ایک تباہی آچکی تھی ، حسن ، دولت اور زندگی کی حقیقت نہ تھی ، دنیا کی بے ثباتی کا تصور ہر خاص و عام کے ذہن پر چھایا ہوا تھا، اس کے علاوہ دہلی بزرگان دین کا مرکز رہا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری میں تصوف اور روحانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ شاعر اپنے ماحول، سماجی وسیاسی حالات سے متاثر ہو کر شاعری کرتا ہے تو یہاں کے شعراء نے بھی اپنے ماحول کے مطابق اس سے متاثر ہو کر شاعری کی ۔ دہلی اسکول کی شاعری میں دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں صنف غزل پر زیادہ توجہ دی گئی۔

اہم خصوصیات دبستان دہلی کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا- تصوف کے مضامین، اخلاق و تصوف فلسفیانہ شاعری ۲- داخلیت ۳- معاملات عشق میں حیا اور پردے کا خاص خیال آہ و درد، حسرت و یاس ، سوز و گداز ۴- سلاست و سادگی ۵ -سنجیدگی ومتانت ۶- حقیقت بیانی و صداقت ۷ - اختصار (غزلیں مختصر) ۸ -محبوب کا حسن فطری انداز میں بیان کرنا، پاکیزگی و نفاست ۹- صنائع و بدائع کا سلیقے سے استعمال ۱۰- دنیائے فانی اور اس کی بے ثباتی کا تصور ۱۱- زمزیت اور اشاریت ۱۲ - معاملات وواقعات صحیح و اصلی ، جذبات و خیل وغیرہ

دبستان لکھنو کی شاعری کی خصوصیات: دبستان لکھنو کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں نشاطیہ عصر نظر آتا ہے۔ بعض خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

ا- تصوف کے مضامین نہ ہونے کے برابر ۲ خارجیت ، اعضاء بدن ، ظاہری چمک دمک کو موضوع بنانا
۳- حقیقی محبت سے خالی ، لب ورخسار، زلف، کمر چال ڈھال، انداز و ادا خارجی بیانات کا اظہار
۴ عریانیت فحش گوئی ، جن زدگی عام تھی ، نعت ، منقبت جیسی اصناف نے ایک اعتدال پیدا کیا۔
۵- جذبات و احساسات کی جگہ صرف لفظی بازیگری، صنائع و بدائع ، قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کی بھر ماریعنی کھیل کھیلنے کا انداز شاعری میں نمایاں ہونے لگا ۔ دہلی میں آہ اور درد تھا لیکن یہاں واہ واہ ۔ طویل غزلیں - اشعار میں تصنع اور بناوٹ وغیرہ ---- لیکن ان سب کے باوجود صنف غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ مثنوی، پر کافی توجہ دی گئی، دوسرا کارنامہ اصلاح زبان کے سلسلے میں محاورات ، تراکیب الفاظ، مذکر مؤنث کے با قاعدہ ضوابط متعین کئے گئے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کومسترد کیا گیا اور فارسی، عربی کو جگہ دی گئی اور اس ضمن میں شیخ امام بخش کا نام سر فہرست ہے۔

جواب نمبر10-(i) سید احتشام حسین اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ماہل میں پیدا ہوئے۔ اعظم گڑھ اور الہ آباد میں تعلیم حاصل کی ۔ احتشام حسین کا اصل میدان تنقید ہے اور وہ شروع سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔

چند کتابوں کے نام : 1- ادب اور سماج ۲ - اعتبار نظر ۳- تنقیدی جائزے ۴- افکار ومسائل

احتشام حسین ہمیشہ ایسے ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی جو مزدوروں، کسانوں کی امنگوں کا ترجمان ہو جس میں غریب کا درد، مظلوم کی آہیں ہو اور ادب ایسا ہو جس سے سماج کا فائدہ ہو۔ ادب پر ان کی پوری گرفت تھی انھوں نے گہرائی اور گیرائی سے ادب کا مطالعہ کیا تھا فنی آداب سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے لیکن کبھی کبھی مقصدیت پر ادب کے فن کو قربان کر دیتے تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ موضوع کے مفہوم پر اپنی توجہ اس قدر ڈال دیتے تھے کہ کبھی کبھی اسلوب کا پہلو یعنی ادب لکھنے کا طریقہ نظر انداز بھی ہو جاتا تھا۔

احتشام حسین کی تنقیدوں کا جو وزن و وقار انھیں حاصل ہوا ہے اس میں ان کی صاف ستھری زبان کا بڑا دخل ہے، ان کے یہاں لفا ظی اور پیچیدگی نہیں ہے بلکہ سیدھے سادے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پر زور دلائل سے اپنی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے علمی نثر کو اپنی تنقید میں استعمال کیا۔ اگر چہ کچھ لوگوں نے ان کی تنقیدوں کو یک طرفہ اور شدت پسندی سے بھری ہوئی بتایا ہے لیکن ان تمام اعتراضات کے باوجود بھی انھیں اردو کا ممتاز ترین نقاد تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کا فرمایا ہوا مستند

(Authentic) مانا جاتا ہے۔

(ii) جمیل مظہری کی نظم " ارتقا "کو غور سے پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ یہ اقبال کی نظم روح ارضی آدم کا استقبال سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، اقبال کی نظم روح ارضی نے آدم کو درس دیا تھا کہ وہ مستقل کوششوں سے دنیا فتح کر سکتے ہیں اور اس نظم میں جمیل نے انسانی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح انسان کو جہد مسلسل سے پیدا ہونے والے نتائج کو نظم کیا ہے۔

اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ خالق کا ئنات نے مجھے (انسان کو) وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں کہ میں خود یعنی انسان اس کی قدرتوں کا شاہکار (بہترین کارنامہ) بن رہا ہوں اور اپنی زندگی کا معمار اور اپنی حقیقتوں کو تخلیق کر رہا ہوں۔ انسان نے تمام چیزوں سے فائدہ اٹھایا جو اس کے اختیار میں تھیں ، ارتقائی مراحل طے کئے اور اپنی کامیابی کے نئے منازل طے کئے ہیں اسی طرح ارتقا کے اس سفر میں کامیابی کے ساتھ اسے ناکامی بھی ملی، تلخ اور شیریں تجربات سے بھی گزرنا پڑا ، اسے زندگی کے حادثات سے بھی دو چار ہونا پڑا لیکن ان حادثات نے اس کے قدم نہیں رو کے بلکہ انسان نے ان سے ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کیا اس طرح انہیں کوتاہیوں اور لغزشوں سے سبق حاصل کر کے تحقیق و حکمت کا سہارا لے کر آگے بڑھ رہا ہے اور اس کا ہر نقش پادنیا کی تاریخ بن رہا ہے، ساتھ ہی جمیل مظہری ہمیں یہ بھی پیغام دیتے ہیں کہ کامیابی کی منزلیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں اس لئے ہمیں ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے اور اپنی عقل کے سہارے ایک کے بعد ایک کامرانی کی منزلیں طے کرنی چاہیئے۔

جواب نمبر11- 1- (B) فورٹ فورٹ ولیم کالج

2 - (B) فیض احمد فیض

3 - (A) کھڑی بولی .

4-(A) 1878ء

5 - (C) سرسید احمد خان